اقبال کا سماجی سائنسی شعور

پروفیسر جلیل عالی

بے شک اقبال کے ہاں وجودی، نفسیاتی، عمرانی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، کائناتی، مابعدالطبیعیاتی، سری، مذہبی اور فلسفیانہ سروکاروں کے ساتھ ساتھ حیاتیاتی وطبیعیاتی سائنسی سروکار بھی موجود ہیں۔ اوران کی شاعری اورتحریروں میں کسی نہ کسی طوران سب کے حوالے منعکس ہوتے ہیں۔ مگر اقبال کی کلیت کو کسی بھی خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ان دائروں کے اختصاصی ماہر کے طور پر دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے سے نہ تو اس کی کلی تفہیم ہو سکتی ہے نہ اس سے پورا انصاف ہی ممکن ہے۔ اس کے فکر واحساس کی تفہیم کے لیے اس کی عظیم شعری وتخلیقی واردات کو بنیاد بنانا ناگزیر ہے جو اس کی ذات کی جملہ جہات کی جامع ہے۔ اس ضمن میں قرآنی متن اور حیات حضورؐ کو پیش نظر رکھنا اس لیے بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کی تخلیقی واردات کا اصل سرچشمہ اور معیار کلام الٰہی اور سیرت رسول پاکؐ ہی ہے۔ جس کی گواہی میں اس کے بہت سے اشعار اور بیانات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بعض اعتبارات سے شعر وتصوف کی بڑی وارداتیں فلسفہ وسائنس سے کہیں آگے کی دنیاؤں کی خبر دیتی ہیں۔ اور عظیم مذہبی واردات تو شعر وتصوف سے بھی زیادہ اعلیٰ ارتقاعی درجات پر فائز ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے لئے کتاب وسیرت فلسفہ وسائنس کے اختصاصی وتحدیدی علوم سے تو کیا شعر وتصوف سے بھی کہیں بڑی دانش کا سرچشمہ ہے۔ اس سرچشمۂ دانش کی لازوال، معجزاتی اور ابدی عظمت و برتری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ ساڑھے چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود نہ تو اس متن کی کثیر الجہت تحریکی توانائیوں میں کوئی کمی آئی ہے نہ اس ذاتِ گرامی سے، جس پر یہ نازل ہوئی، عالم انسانی کے بہت بڑے حصے کی ہزار پہلو وابستگی میں کوئی فرق واقع ہوا ہے۔ بڑے بڑے فلسفے اور فلسفی اپنی اپنی عمریں پوری کر کے قصہ پارینہ ہو جاتے ہیں مگر یہ لازوال متن اور رشتۂ محبت ہر زمانے میں صدرنگ پہلوؤں سے ایک زندہ وفعال حوالہ بنتا چلا آرہا ہے اور تا ابد بنتا چلا جائے گا۔ اس پہلو سے اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قلندر جز دو حرفِ لا الہ، کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا[1]

بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است[۲]
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہ قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ[۳]
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط تقدیر الٰہی کا ہے پابند[۴]
خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ[۵]

اس سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ اس حوالے نے ایک بے مثال و بوقلموں تہذیب کو جنم دیا جو بڑے بڑے حادثوں کے باوجود نابود نہیں ہوتی۔ یہ حوالہ کبھی فکر و سائنس میں اپنا جوہری تحرک دکھاتا ہے، کبھی ادب و فنون میں جلوہ نما ہوتا ہے، کبھی دنیا کے نقشے پر نئی ریاستوں کا قیام عمل میں لاتا ہے اور کبھی استعماری قوتوں کے مقابل عالمگیر مزاحمت کی علامت بن جاتا ہے۔

دانش کے اس عظیم سرچشمے کی تحریک سے جنم لینے والی اقبال کی غیر معمولی شعری واردات کے تین اساسی پہلو ہیں: ایمان، عشق اور علم۔ یہ تینوں پہلو آپس میں گہرا ربط رکھتے اور ایک نامیاتی وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ تاہم اقبال کے ہاں مقام و مرتبے کے لحاظ سے ایک درجہ بندی بھی موجود ہے۔

اقبال کے نزدیک علم بے حد ضروری شے ہے۔ مگر وہ قرآنی تعلیمات کے مطابق علم نافع اسی صورت میں بنتا ہے جب وہ خلقِ خدا کی بھلائی کے نصب العین کو پیشِ نظر رکھے۔ یوں علم، عشق کی ضرورت تو ہوسکتا ہے عشق کا بدل نہیں ہوسکتا۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من — عشق است امام من عقل است غلام من[۶]
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک[۷]

کیونکہ:

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں[۸]
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت — جو اس سے نہ ہوسکا وہ تو کر[۹]

اور عشق کو اعلیٰ مراتب کی طرف صعود کرنے کے لیے ایمان و ایقان سے ہم رشتہ ہونا پڑتا ہے:

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام[۱۰]
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰی — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام[۱۱]

اپنے مخصوص دائرے میں عقلی و علمی اہلیت کی اپنی اہمیت ہے۔ اور بے شک ایک حد تک یہ اہلیت انتہائی ناگزیر بھی ہے۔ مگر اس کے اپنے منطقے سے آگے بلند تر اور غیر معمولی صداقتیں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا ان برتر صداقتوں کا تقاضا یہ ہے کہ:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے[۱۲]

اگر اوپر بیان کی گئی تدریج پیشِ نظر رہے تو یہ جاننا آسان ہو جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ اقبال فلسفی ہے بھی اور نہیں بھی۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی کلیت میں اقبال فلسفے کی مخصوص تعریف کے مطابق فلسفی نہیں ہے مگر قاری کو اپنے ارتقائی ویژن تک لے جانے کے لیے وہ ایک خاص مسافت تک فلسفے کی سواری سے بھی کام لیتا ہے۔ یوں یہ سوال کہ اقبال فلسفی ہے یا نہیں ایک خاص دائرۂ دانش کا مباحثہ بنا ہوا ہے اور بنا رہے گا۔

اس بات کو اقبال کے لیکچرز کے حوالے سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ اقبال اپنے لیکچرز میں علم کے تین ذرائع کا ذکر کرتا ہے: تاریخ، مشاہدہ اور وجدان۔ اور پھر وجدان اور وحی میں فرق واضح کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے ذریعے تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر انسانیت کی الوہی رہنمائی کا کام مکمل ہو گیا۔ اور انسان میں اتنی پختگی آ گئی کہ وہ منطق استقرائیہ کے توسط سے درست نتائج تک پہنچنے اور اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسی لیے اب مزید الوہی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہاں تک تو یقیناً اقبال ایک آزاد فلسفی کا بیانیہ برت رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے اقبال اپنے نظریات کی کلیت کے لحاظ سے یہ تو نہیں کہہ رہا ہے کہ اب آگے انسان کو مکمل ہو چکی الوہی رہنمائی سے بھی آزاد سمجھا جائے۔ وہ اپنے اس ایقان سے دستبردار تو نہیں ہو گیا کہ انسان قیامت تک قرآن و سیرت کی رہنمائی کا محتاج رہے گا۔ اگرچہ اس رہنمائی کے ناگزیر ہونے کے حق میں بعض عقلی دلائل بھی دیے جا سکتے ہیں تاہم یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال خالص فلسفی نہیں رہ جاتے۔ اور چونکہ اسے خالص فلسفیانہ تائید کے بغیر بھی یہ صداقت اپنی طرف کھینچتی ہے، اس لئے یہاں سے آگے عشق و ایمان کی اقلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں اس مضمون کے آغاز میں بیان کیے گئے جملہ منطقوں سے متعلقہ علوم کے بارے میں اقبال کی آگہی اور اس کی طرف سے بعض وقیع اضافوں کا مبسوط جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اقبالیات کے حوالے سے ان شعبوں کو پہلے کسی نے چھوا ہی نہ ہو۔ کئی اقبال شناس ایسے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ اقبال کی فکر میں علمی و سائنسی شعور بشری و طبیعی دونوں طرح کے علوم سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے کلام اور نثری تحریروں میں بھرپور طور پر منعکس ہوتا ہے۔

اقبال کی نثری تحریروں خصوصاً ان کے خطبات ''اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ نو'' میں ان کا طبیعی سائنسی شعور خالص علمی زبان میں سامنے آیا ہے اور اس میں اقبال کے زمانے کی طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم کی دریافتوں کے بہت سے حوالے موجود ہیں۔ بعض اصحاب اس کتاب کے مندرجات کے ناتے اقبال کو ایک خالص ماہر

طبیعیات یا ماہرِ حیاتیات تصور کر کے ہدف تنقید بنانے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کتاب کا موضوع طبیعیات وحیاتیات ہے اور نہ اقبال کوئی باقاعدہ ماہرِ طبیعیات و ماہرِ حیاتیات ہے۔ اس کا موضوع ہے: اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل۔ یعنی اسلام سے تحریک پا کر مسلم مفکروں نے مذہبی فکر کی جو روایت بنائی اقبال نے اسے ایک نئی صورت عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس نئی فکری تشکیل میں اس نے اس وقت کے عصری قدرتی علوم کی دریافتوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان خطبات میں ان علوم کی زندہ بحثوں کے تازہ تر حوالے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ایک شاعر اور دانشور ہوتے ہوئے اقبال ان سے کس قدر آگاہ تھا۔ اقبال کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ فزکس کی ریاضیاتی مساواتیں سمجھنے کے لئے انہوں نے باقاعدہ ریاضی کی ٹیوشن بھی پڑھی۔ شعر وفلسفہ کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کی قدرتی علوم سے ایسی سنجیدہ دلچسپی لائقِ صد تحسین ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اقبال کے تصورِ زماں پر خالص سائنسی حقائق اور اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بے حد دقیق و وقیع کتاب تحریر کی۔ وہ اپنے ایک مضمون ''اقبال کے نظامِ فکر میں سائنس کا مقام'' میں لکھتے ہیں:

> یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ اقبال نے ایسے زمانے میں نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کے نتائج اور استدلال کو اپنے خطبوں میں استعمال کیا ہے جب کہ خود مغربی ممالک میں بہت کم دانشور ان نظریوں سے واقف تھے یا ان کو کماحقہ سمجھ سکتے تھے۔[۱۳]

اس حوالے سے اقبال کے خطبات سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

> جس جسم کا مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ متغیر ہے اور مشاہدہ کرنے والے شخص کے لحاظ سے اضافی ہے۔ مشاہدہ کے مقام اور اس کی رفتار کے ساتھ جسم کی کمیت، شکل اور جسامت بدلتی رہتی ہے۔ حرکت اور سکون بھی مشاہد کے لحاظ سے اضافی ہیں۔[۱۴]

نظریۂ اضافیت کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> آئن سٹائن کے خیال کے بموجب کائنات کسی محدود خلا میں جزیرہ نہیں ہے بلکہ وہ متناہی ہے لیکن غیر محدود ہے جس کے آگے کوئی فضا نہیں۔[۱۵]

اقبال ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اسلام نے ہمیں دنیا میں چلنے پھرنے، فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور وفکر کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور کائنات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے۔ کلامِ الٰہی کی اس تلقین کے ذکر کے بعد وہ لکھتا ہے کہ:

> یہاں توجہ طلب امر قرآن کی وہ حقیقت پسندانہ روش ہے جس سے مسلمانوں کے اندر عالمِ واقعی کا احترام پیدا ہوا اور جس کی بنا پر آگے چل کر انہوں نے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی۔ پھر یہ بات کہ تجربے اور مشاہدے کی اس روح کو اس زمانے میں بیدار کیا گیا جو خالقِ کائنات کی جستجو میں عالمِ محسوسات کو بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر چکا تھا، کوئی معمولی واقعہ نہیں۔[۱۶]

اقبال مطالعۂ کائنات اور سائنسی تحقیق کو اسلامی رُو سے عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ اقبال کے اپنے الفاظ میں:

غرض کہ جو تشریح ہم نے اوپر دی ہے وہ طبیعی سائنس کو ایک قسم کی روحانیت عطا کرتی ہے............ نیچر کا علم خدا کی خدائی کا علم ہے۔ جب ہم نیچر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو گویا انائے مطلق کے قریب تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک طرح کی عبادت ہے۔ [۱۷]

اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اگر چہ مذہب کی روح ایمان اور عقیدہ ہے تاہم اس میں عقل و شعور کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے اسے سائنٹیفک طریقے سے سمجھنا اور سمجھانا بھی ضروری ہے۔ اس حوالے سے اس کا ایک اقتباس دیکھیے:

آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے کائنات کے ایک جدید تخیل کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم فلسفہ اور مذہب کے مشترکہ مسئلوں کو نئے زاویوں سے ملاحظہ کریں۔ [۱۸]

انسان کی سیاسی و معاشی اور معاشرتی و تہذیبی زندگی میں بشری و سماجی علوم کی اہمیت بھی طبیعی سائنسی علوم سے کسی طور کم نہیں ہے۔ ان علوم میں ایک دانشور شاعر و ادیب کی دلچسپی اس کی تخلیقات کی معنوی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ فلسفے کا تو اقبال باقاعدہ طالب علم رہا تاہم بشری و سماجی سائنس کے دیگر شعبوں میں بھی اس کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ بشری و سماجی علوم کے حوالے سے اقبال کے سائنسی شعور پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس کے کلام اور اس کی نثری تحریروں میں نفسیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، تاریخ، فلسفۂ تاریخ، مذہبیات، مابعد الطبیعیات اور تصوف کے عمیق اور بے حد وقیع نکات سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک علوم کے حوالے سے اقبال کے سائنسی شعور کے بارے میں مختصر مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

نفسیاتی شعور

اقبال انسان کی شخصیت کی ہمہ پہلو نشو و نما کو اہم جانتا ہے اور اس میں زندگی کے عملی رخ پر خصوصی زور دیتا ہے۔ ایسے تصوف کو رد کرتا ہے جو رہبانیت کا درس دیتا ہے اور انسان کی عملی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ وہ انسان کی عملی فکریات کو متحرک کرتے ہوئے خود انسانی وجود اور اس کے گرد و پیش میں تعمیری رجحانات و اقدامات کی نمو کو اولیت دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان جب تک اندر سے مضبوط نہ ہو وہ اپنے گرد و پیش میں بھی کوئی تبدیلی لانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ اس ضمن میں وہ ایک مناسب حد تک انسان کی معاشی آسودگی کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اپنی پہلی نثری کتاب علم الاقتصاد کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی و تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ [۱۹]

اور انسانی شخصیت کے اسرار و رموز جانے بغیر انسان کے اندرونی استحکام کا ہدف حاصل نہیں ہو سکتا۔ انسانی صلاحیتوں سے آگاہی اوران کی تراش خراش سخت محنت کا تقاضا کرتی ہے:

تیری طبیعت ہے اور، تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ[۲۰]
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے[۲۱]
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن[۲۲]
تیری قندیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی[۲۳]
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد[۲۴]
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[۲۵]
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ[۲۶]

اقبال نے شخصیت کی تشکیل و تعمیر اور استحکام و ارتقاع کے حوالے سے ایک جامع اور مربوط تصور کی صورت گری کی جس کو اس نے خودی کا نام دیا۔ ان کے لیکچروں کی کتاب اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل کے چوتھے لیکچر کا عنوان ہی ''خودی، اس کی آزادی اور بقا'' ہے۔ اس میں اس نے انسانی شخصیت کے ماہر بڑے بڑے نفسیات دانوں اور مفکروں جن میں بریڈلے، غزالی، کانٹ، ولیم جیمز، پرنگل پیٹی سن، ڈیکارٹ، لائبنز، سپینگلر، ابنِ رشد، جلال الدین رومی، رینان، جاحظ، ابنِ مسکویہ، ہربرٹ سپینسر، نٹشے اور دوسرے شامل ہیں کے تصورات کا گہرا جائزہ لیا اور پھر اپنے منفرد تصورِ خودی کے خدوخال اجاگر کیے۔

بیاضِ اقبال میں ''شخصیت کی بقا'' کے زیرِ عنوان اقبال نے شخصیت کو قوتوں کی ایک خاص ترتیب کا نام دیا ہے۔ شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ لہٰذا اس کو خیرِ مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبانے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔ اگر ہم وہ طرزِ زندگی اختیار کریں جس سے

شخصیت کو تقویت پہنچے تو دراصل ہم موت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ موت، جس کی ضرب سے ہماری شخصیت کی اندرونی قوتوں کی ترتیب گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ پس شخصیت کی بقا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔

اقبال یہ نکتہ وحدت الوجودی صوفیا کی طرح بندے اور خدا کے تعلق کو قطرے اور سمندر کے استعاروں میں بیان کرنے کی بجائے موتی اور سمندر کے استعاروں میں بیان کرتا ہے۔ کیوں کہ قطرہ سمندر میں داخل ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور موتی سمندر میں رہ کر بھی اپنا الگ وجود برقرار رکھتا ہے۔ تصورِ خودی اقبال کے نظامِ فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ان کے کلام میں بھی جگہ جگہ اس کی مختلف معنیاتی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے　　فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے [۲۷]
خودی ہے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال　　کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں [۲۸]
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی　　خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش　　خودی کی زد میں ہے ساری خدائی [۲۹]
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداریِ کائنات [۳۰]
خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات　　کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات [۳۱]

اقبال سمجھتا ہے کہ معاشرے میں فعال تعمیری کردار ادا کرنے کے لئے انسانی شخصیت کو جلالی و جمالی دونوں صفات سے مالا مال ہونا چاہیے۔ شر کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے جلالی خصوصیات کو بروئے کار لانا ناگزیر ہو جاتا ہے، ورنہ حسن و خیر کے فروغ کا ہر اقدام بے نتیجہ رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے مثالی انسان، جسے وہ مردِ مومن، مردِ کامل، مردِ قلندر یا مردِ حر کا نام دیتا ہے، کے لئے وہ ضروری خیال کرتا ہے کہ وہ رزم و بزم دونوں کے تقاضوں پر پورا اترنے والی شخصیت کا مالک ہو۔ اس کی بصیرت کا سرچشمہ بھی قرآنی روح اور حضورؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [۳۲]

محمد رسول اللہؐ اور وہ لوگ جو آپ پر ایمان لائے ہیں کفار پر سخت اور آپس میں نرم ہیں۔

اقبال نے اسی تعلیم کو اپنے اشعار میں یوں ڈھالا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن [۳۳]

گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا [۳۴]
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان [۳۵]

عمرانی شعور

افراد کے مجموعے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔تاہم فرد کی طرح معاشرہ اپنی الگ اکائی بھی رکھتا ہے۔اور معاشرے کی حرکیات اور ارتقا کے اپنے اصول ہیں جو ماہرینِ عمرانیات کے مطالعے اور غور وفکر کا موضوع بنتے ہیں۔کوئی بھی ریفارمر جو معاشرے کی بہتری چاہتا ہے یا اسے اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے وہ گہرے عمرانی شعور کے بغیر یہ کام نہیں کرسکتا۔اقبال بھی چونکہ قرآنی تعلیمات اور حضورؐ کی سیرت سے تحریک پا کر ایک اعلیٰ درجے کا فلاحی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا تھا،اس لیے انسانی زندگی کے عمرانی پہلوؤں پر غور وفکر ناگزیر تھا۔چنانچہ اس نے انسانوں کے باہمی تعامل، انسانی معاشرے میں تبدیلیوں کے عمل، معاشرے کے اجتماعی تشخص،اجتماعی معاشرتی رویوں،اجتماعی شعور،معاشرتی استحکام،معاشرے میں اخلاقی و روحانی اصولوں کی کارفرمائی،فرد اور جماعت کے باہمی رشتے،قوموں کے عروج وزوال اور ایسے بہت سے دوسرے موضوعات پر گہری نگاہ ڈالی۔ پہلے سے موجود ماہرین عمرانیات کے افکار کا جائزہ لیا،ان سے استفادہ بھی کیا اور ان کے تنقیدی تجزیے کے بعد اپنے خیالات بھی پیش کیے۔اس کی نثری تحریروں اور شاعری میں اس کی عمرانی بصیرت جگہ جگہ بروئے کار آئی ہے۔ان کا ایک انگریزی مضمون،جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے کیا،بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس میں اقبال نے انسانوں کی کسی جماعت کے اجتماعی وجود کے حوالے سے بڑی نکتے کی بات کہی ہے:

> یہ خیال کہ......(قوم)اپنے افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے۔اس کی ماہیت پر اگر نظرِ غائرڈالی جائے تو معلوم ہوگا یہ غیر محدود اور لامتناہی ہے،اس لیے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِنظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں،لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے......موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع ہوتی ہیں بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں جو نسل بعد نسل بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔[۳۶]

اپنے ایک مضمون ''قومی زندگی'' میں بھی اقبال نے قومی وجود کے تسلسل کے لئے فکر واحساس میں قوم

کے مستقبل کو ایک زندہ عنصر کے طور پر پیشِ نظر رکھنے کی اہمیت واضح کی ہے:

قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے بلکہ اگر اسے اقوامِ عالم کے دفتر میں اپنا نام رکھنا منظور ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریق اختیار کرے جس کے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدن بھی شامل ہو۔[۳۷]

اسی لیے اقبال نے اپنے کلام میں بھی ایسے کئی اشارے کیے ہیں جو قوموں کے مستقبل کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتے ہیں:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں[۳۸]

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب[۳۹]

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے[۴۰]

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں[۴۱]

فلسفۂ تاریخ

انسانی معاشرے اور تہذیب وتمدن سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین تاریخ کے بڑے عمل میں کارفرما اصولوں پر غور وخوض کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس حوالے سے تاریخی طور پر ابنِ خلدون کے 'مقدمۂ تاریخ' کو اولیت حاصل ہے۔ ابنِ خلدون کے علمی تجزیوں کی قدر و قیمت کی بنا پر اسے تاریخ وعمرانیات کی سائنس کا بنیاد گزار قرار دیا جاتا ہے۔ فکرِ اقبال میں اس حوالے سے بڑے وقیع اشارے موجود ہیں۔ اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ نویسی کو سائنسی بنیادیں فراہم کرنے میں بھی قرآنی دانش کا بہت بڑا کردار ہے۔ سائنسی اصولوں کے مطابق تاریخ نویسی کے بنیاد گزار ابنِ خلدون کے حوالے سے اقبال اس نکتے کو یوں سامنے لاتا ہے:

جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ اگر اس سمت کو پیشِ نظر رکھا جائے جس میں اسلامی ثقافت نے اپنا افشا کیا ہے، تو ممکن طور پر وہ کوئی مسلمان ہی ہو سکتا تھا، جو تاریخ کو جاری 'عملِ اجتماعی حرکت' اور زمان کے اندر ایک ناگزیر کارفرمائی سمجھتا۔ تاریخ کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ابن خلدون عملِ تغیر کی تعبیر کیسے کرتا ہے۔ اس کی یہ تعبیر لامتناہی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ مضمرات ہیں کہ تاریخ زمان کے دوران ایک مسلسل حرکت کے طور پر، ایک خالصتاً تخلیقی حرکت ہے اور وہ کوئی ایسی حرکت نہیں ہے جس کا راستہ پہلے سے متعین ہو۔[۴۲]

اقبال کا خیال ہے کہ تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں رسولِ اکرمؐ اس مرحلے پر تشریف لائے جب انسانیت بلوغت کو پہنچ گئی تھی اور اب اسے مزید الہامی رہنمائی کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اور یہی باعث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اسی نکتے کو وہ یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے علمی دنیا میں منطقِ استخراجیہ سے نتائج تک پہنچا جاتا تھا مگر اسلام نے منطقِ استقرائیہ کے طریقِ کار کو متعارف کرایا اور عملی مشاہدے کی مدد سے نتائج مرتب کرنے کا راستہ دکھایا:

مسلم ثقافت کی روح کے بارے میں پہلا قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ علم کے مقصد کے لیے وہ ٹھوس اور متناہی پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ مزید واضح ہے کہ اسلام میں مشاہدے کے طریقِ کار اور تجربے کے طریقِ کار کی پیدائش یونانی فکر سے مفاہمت کے باعث نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے طویل خردمندانہ تصادم کا نتیجہ تھی۔[۴۳]

قوموں کے عروج و زوال کے حوالے سے وہ علمِ معاشیات پر اپنی پہلی علمی کتاب علم الاقتصاد میں لکھتے ہیں:

.....بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور ان اشیا سے بے پروا رہنے کی وجہ سے ہوئی جن سے انسانی زندگی کو حقیقی مسرت اور جلا حاصل ہوتی ہے۔ زمانۂ حال کی تہذیب اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے۔[۴۴]

اقبال کی شاعری میں بھی کئی مقامات پر عیش و عشرت، غرورِ قوت اور بے عملی کو قوموں کے زوال کا سبب قرار دیا گیا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ امم کیا ہے　　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر[۴۵]
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　　ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[۴۶]
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے　　　صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و سبک گیر کے آگے　　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک[۴۷]
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا[۴۸]
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی　　　روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم　　　کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب[۴۹]

اقبال قرآنی حکمت سے یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ افراد کی سزا اور جزا کا آخری حساب تو روزِ حشر ہو گا مگر قوموں کی مکافاتِ عمل اسی دنیا میں واقع ہوتی رہتی ہے:

..... یہ قرآن کی لازمی تعلیمات میں سے ایک ہے کہ قوموں کا محاسبہ مجموعی طور پر ہوتا ہے اور وہ اپنے کیے کی جزا اب اور یہیں بھگت لیتی ہیں۔[۵۰]

اس نکتے کو وہ اپنے ایک شعر میں اجاگر کرتے ہیں:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف[۵۱]

مختلف اقوام کے حوالے سے اقبال کی کئی پیشین گوئیوں کی صداقت ان کے عمیق تمدنی تجزیوں اور فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ان کے گہرے شعور کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتی ہے۔

جس وقت سلطنتِ برطانیہ آدھی سے زیادہ دنیا تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کی وسیع حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اقبال نے اس وقت کہا تھا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، نا پائیدار ہو گا[۵۲]

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے[۵۳]

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے[۵۴]

اسی طرح افیون زدہ چینی معاشرے کی تہوں میں کسی معجزاتی جوہر کی آشنائی نے اقبال سے یہ کہلوایا:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے[۵۵]

ایشیا کے موجودہ حالات میں افغانستان کی مرکزی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کی تاریخی بصیرت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے یہ اشعار دیکھیے:

آسیا یک پیکرِ آب و گل است
ملتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ اُو فسادِ آسیا
در کشادِ اُو کشادِ آسیا[۵۶]

ترکی اقبال کے زمانے میں کمال اتاترک اور عصمت انونو کی سیکولر انتہا پسندی کی گرفت میں تھا۔ مگر اقبال کی فلسفہ تاریخ کی گہری بصیرت سے بہرہ ور عمرانی نگاہ مسلم ترکی معاشرے کے باطنی جوہر سے کس قدر آگاہ تھی اس کا اندازہ موجودہ ترکی کے تیزی سے اپنی اسلامی تہذیبی شناخت کی طرف بڑھتے قدموں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں مذہب وسلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے نہ کہ عقائد کی۔ اسلامی ممالک میں مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے جو صدیوں سے اسلامی روحانیت کے تحت پرورش ونمو پاتا رہا ہے۔ تجربہ خود بتلا دے گا کہ یہ تخیل جدید ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ [۵۷]

مولانا جلال الدین رومی کے مزار کے احاطے میں اقبال کی علامتی قبر اقبال سے ترکوں کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مجھے ۲۰۰۷ میں چند پاکستانی دانشوروں اور طلبہ کے ایک وفد کے ساتھ ترکی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دورے کے دوران استنبول میں ترکی کے قلمکاروں اور صحافیوں کی سب سے بڑی تنظیم کے عہدیداروں سے ملاقات کے موقع پر انجمن کے صدر نے ہمیں جب ترکی زبان میں اقبال کی نظم ''حضورِ رسالت مآبؐ میں'' سنائی تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں سے اقبال کی محبت اور عشقِ رسول کی سرمستی میں مسلسل آنسو جاری رہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں برپا ہونے والے عظیم ایرانی انقلاب کے پیچھے افکارِ اقبال کے عظیم الشان کردار سے کون واقف نہیں ہے۔ انقلابِ ایران کے بنیادگزار مفکر علی شریعتی کے اقبال کے فکر وفن پر لکھے گئے مضامین اس کے زندہ گواہ ہیں۔

پاکستان کے نامور ماہرِ اقبالیات صدیق شبلی بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک بار سوویٹ روس سے آزاد ہونے والی ریاست تاجکستان کی کسی یونیورسٹی میں لیکچر کے دوران اقبال کی فارسی نظم کا ٹیپ یہ مصرع پڑھا

''از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز''

تو تمام سامعین کھڑے ہو گئے اور سب نے کورس کی صورت یک زبان ہو کر پوری نظم پڑھ ڈالی۔ وہ اس دوران حیرت کی ایک عجیب کیفیت میں ڈوبے رہے۔ تقریب کے اختتام پر ان کے استفسار پر بتایا گیا کہ یہ نظم تو تاجکستان کے نوجوانوں کا تحریکی ترانہ ہے۔

یہ اقبال کے عمرانی شعور کے عملی اثرات کی چند مثالیں تھیں۔

فرد و جماعت

فرد اور جماعت کا باہمی تعلق عمرانیات کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اقبال کے شعر وفکر میں اس حوالے سے بھی وقیع نکات نمایاں ہوئے ہیں۔ جن میں دوسرے ماہرینِ عمرانیات سے استفادے کے ساتھ ساتھ اقبال کے اپنے نتائجِ فکر بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال اسپنسر کی طرح عضویاتی مشابہت کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بنی نوعِ انسان ایک بڑے جسم کی طرح ہیں کہ مختلف ممالک یا اقوام اس کے اعضا ہیں جو اپنے اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی سے 'بنی آدم اعضائے یک دیگر ند' کا پورا مفہوم ظاہر کرتے ہیں اور اس طرح جسم کی پرورش اور تربیت کرتے ہیں۔ [۵۸]

اقبال نے اپنے اشعار میں بھی فرد اور جماعت کے تعلق کے بارے میں انتہائی پُر بصیرت نکتے اجاگر کیے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں　　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں [۵۹]
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ [۶۰]
ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ　　　پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ [۶۱]

سیاسی و معاشی شعور

اقبال ریاستی امور میں اخلاقی و روحانی اقدار کی پاسداری کو ضروری سمجھتے تھے مگر پاپائیت کے سخت خلاف تھے۔ اسلام کے گہرے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام ان معنوں میں ہرگز مذہب نہیں ہے جن معنوں میں انسانی تاریخ مسیحی پاپائیت کے تجربے سے گزری ہے۔ اسلام کے بارے میں اپنے عمرانی وتہذیبی اور سیاسی شعور کی بنیاد پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام میں نہ کبھی پاپائیت رہی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی تاریخ میں کسی لوتھر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے خطبات میں بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اسلام تو ایک مسلسل سماجی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کے اس اختصاص کا ذکر ان کے خطبہ الٰہ آباد میں بھی موجود ہے:

> ہندوؤں کے دل میں اس طرح کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی...... اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ انسان شجر وحجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ [۶۲]

اپنے اس تصور کو انھوں نے اپنے ایک لازوال شعر میں ڈھال کر ملتِ اسلامیہ کو خصوصی طور پر اس اساسی حقیقت کی طرف یوں متوجہ کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی [۶۳]

اقبال اپنے زمانے کی تمام اہم عالمی تحریکوں سے آگاہ تھے۔ ان کے زمانے میں سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکیت کے درمیان کشمکش اپنے عروج پر تھی۔ قرآن وسنت کے مطالعے نے انھیں ایک متوازن اندازِ فکر کی راہ سجھائی جس کی جھلک ان کے فکر کے تمام زاویوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی بصیرت کے باعث وہ

استحصال کی تمام صورتوں کے مخالف تھے اور انھوں نے ہر طرح کی آمریت، بادشاہت، جاگیرداریت اور خانقاہیت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں کہتے ہیں:

......اس نئی تہذیب (اسلام) نے اتحادِ عالم کی بنا توحید پر رکھی۔ لہٰذا بطور اساس ریاستِ اسلام ہی وہ عملی ذریعہ ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیاتِ عقلی اور جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کر لے، کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک و سلاطین کی۔ [۶۴]

ان کے کلام میں بھی اس کے واضح اشارے موجود ہیں:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی [۶۵]

وہ سرمایہ داری نظام کو انتہائی ظالمانہ نظام گردانتے تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اس پر سخت تنقید کی ہے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر　　پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری [۶۶]
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری [۶۷]
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ　　''خواجگی'' نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات [۶۸]
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و درویشی و پیری [۶۹]
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا　　جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے [۷۰]
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں　　تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں [۷۱]

انسانی تاریخ میں سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کے ردِعمل میں کارل مارکس کے تصورات کے زیرِ اثر اشتراکیت کی انقلابی تحریک برپا ہوئی، جو تیزی سے آگے بڑھی اور آدھی سے زیادہ دنیا پر چھا گئی۔ اقبال کا زمانہ اس تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ اقبال نے اس کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے مقاصد اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں تک کہا کہ اس تحریک کے مثبت اثرات سے اس بات کا امکان ہے کہ آگے چل کر اس سے قرآن کی اس آیت کے معانی عملی طور پر واضح ہوں کہ

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط [۷۲]

اے رسول تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا دیں؟ ان سے کہو کہ ضرورت سے زیادہ جو کچھ بھی ہے دے دو۔

اس کے بارے میں شعر کی زبان میں کہتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العَفو، میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار[۷۳]
اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو[۷۴]
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں[۷۵]
خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب[۷۶]

مزدور کے لہو سے آقا ہیرے ڈھالتا ہے اور دیہات کے خداؤں سے کسان کی کھیتی برباد ہے

مگر اقبال نے اس تحریک اور نظامِ فکر کے سراسر مادی بنیادوں پر مبنی ہونے اور انسان کے روحانی پہلو کی نفی کرنے پر تشویش محسوس کی اور اس پہلو سے اس پر کھل کر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔ اور اخلاقی و روحانی قدروں کی پاسداری کے بغیر اسے بھی انسانی جبر واستحصال کی ایک صورت قرار دیا:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[۷۷]

اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اشتراکیت نے نفی کی منزل تو طے کر لی ہے مگر اثبات کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ اسلامی اصطلاحوں میں ''لا'' کی منزل سر ہوگئی مگر ''الّا'' کے مقام تک نہیں پہنچے۔ یعنی اس نظریے اور تحریک نے مادی پہلو سے ملوکیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بت تو پاش پاش کر ڈالے مگر اللہ تعالیٰ کے اقرار تک رسائی حاصل نہیں کی جس کی وجہ سے زندگی کا روحانی پہلو صرفِ نظر ہو گیا۔ اس تفصیل کو انتہائی سادہ اجمالی صورت میں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اشتراکیت + خدا = اسلام۔ اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی زباں سے انسانیت کی خیر وفلاح کے دشمنوں کے لئے اصل خطرہ اشتراکیت نہیں اسلام کو قرار دیا۔ اور ابلیس کی زبان سے کہلوایا کہ:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روز گار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایّام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے[۴۸]

ریاست کو اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار کا پاسباں بنانے اور مذہبی قوتوں کے فکر و عمل کو عوامی مسائل سے وابستہ رکھنے کے لیے اقبال کا روحانی جمہوریت کا تصور اور مذہبی قانون سازی کا اختیار منتخب پارلیمنٹ کو دے دینے کا موقف بھی ان کے گہرے سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

انسان کی نفسی اور سماجی زندگی کی جملہ جہات میں دیگر مفکرین کے افکار سے استفادے کے ساتھ ساتھ اقبال نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں کئی ایسے طبع زاد خیالات کا اظہار کیا ہے جو سماجی علوم کے وقیع تعقلات اور نظریات کی تشکیل میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات و حواشی

۱- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷۲
۲- ایضاً، ص ۵۴۷
۳- ایضاً، ص ۳۶۵
۴- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۷۸
۵- ایضاً، ص ۳۸۵
۶- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۳۱
۷- اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۹۸
۸- ایضاً، ص ۳۷۹
۹- ایضاً، ص ۳۹۱
۱۰- ایضاً، ص ۴۱۷
۱۱- ایضاً، ص ۴۱۸
۱۲- ایضاً، ص ۴۱۲
۱۳- جاوید یونس (مرتب)، صحیفہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸، ۱۹

14- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 2019, P. 31
15- Ibid.
16- Ibid., p. 11.

17- Ibid., p. 45
18- Ibid., p. 6

۱۹- دیباچہ،ص۲۵
۲۰- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۴۰۲
۲۱- ایضاً،ص۳۰۵
۲۲- ایضاً،ص۳۷۱
۲۳- ایضاً،ص۳۸۷
۲۴- ایضاً،ص۶۴۳
۲۵- ایضاً،ص۴۵۳
۲۶- ایضاً،ص۵۲۲
۲۷- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۴۵۵
۲۸- ایضاً،ص۷۴۷
۲۹- ایضاً،ص۴۱۰
۳۰- ایضاً،ص۴۵۴
۳۱- ایضاً،ص۷۲۵
۳۲- سورۃ الفتح ۴۸:۲۹
۳۳- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۵۵۸
۳۴- ایضاً،ص۳۰۴
۳۵- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۵۷۳
۳۶- معینی،عبدالواحد(مرتب)،مقالاتِ اقبال،شیخ محمد اشرف،لاہور،باراوّل،۱۹۶۳،ص۷۷
۳۷- ایضاً،ص۳۹
۳۸- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۲۰۲
۳۹- ایضاً،ص۴۲۵
۴۰- ایضاً،ص۴۲۵
۴۱- ایضاً،ص۳۹۴
۴۲- اقبال،علامہ محمد،اسلامی فکر کی نئی تشکیل،شہزاد احمد(مترجم)،ص۱۷۳
۴۳- ایضاً،ص۱۶۰
۴۴- اقبال،شیخ محمد،علم الاقتصاد،ص۴۹
۴۵- اقبال،علامہ محمد، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۸۶
۴۶- ایضاً،ص۴۸۸
۴۷- ایضاً،ص۵۴۱
۴۸- ایضاً،ص۶۳۱

۴۹- ایضاً،ص۴۲۵
۵۰- اقبال،علامہ محمد،اسلامی فکر کی نئی تشکیل،شہزاد احمد (مترجم)،ص۱۶۸
۵۱- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۵۹۹
۵۲- ایضاً،ص۱۶۷
۵۳- ایضاً،ص۳۹۹
۵۴- ایضاً،ص۶۷۱
۵۵- ایضاً،ص۴۵۰
۵۶- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (فارسی)،ص۷۶۵-۷۶۶
۵۷- شروانی،لطیف احمد (مرتب)،حرفِ اقبال، المنار اکادمی،لاہور،ص۱۶۹
۵۸- علم الاقتصاد،ص۵۳
۵۹- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۲۱۷
۶۰- ایضاً،ص۷۱۳
۶۱- ایضاً،ص۲۷۷
۶۲- اقبال،علامہ محمد،خطباتِ اقبال،رضیہ فرحت بانو،(مرتب)،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،ص۴۰
۶۳- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۲۷۷
۶۴- اقبال،علامہ محمد،تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ،سید نذیر نیازی (مترجم)،بزمِ اقبال لاہور،ص۲۲۷
۶۵- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۳۷۸
۶۶- ایضاً،ص۲۸۹
۶۷- ایضاً،ص۲۹۰
۶۸- ایضاً،ص۲۹۲
۶۹- ایضاً،ص۷۲۷
۷۰- ایضاً،ص۳۰۵
۷۱- ایضاً،ص۴۴۵
۷۲- سورۃ البقرہ ۲:۲۱۹
۷۳- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۶۴۸
۷۴- ایضاً،ص۴۳۴
۷۵- ایضاً،ص۷۱۰
۷۶- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (فارسی)،ص۴۸۶
۷۷- اقبال،علامہ محمد،کلیات اقبال (اردو)،ص۳۷۸
۷۸- ایضاً،ص۷۰۹